حقیقتِ حال

یعنی

اعلیٰ حضرت ہز اگزالٹیڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک

میر عثمان علی خاں بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت برطانیہ جی سی ایس آئی

جی سی بی ای دام ملکہم و خلد سلطنتہم

موجودہ فرماں روائے دکن کے عہد حکومت پر مختصر ریویو اور بعض متعصب

مضمون نگاروں کے غلط بیانات کی تردید

جس کو

خاکسار نظامی بدایونی مالک و ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین بدایوں عفی عنہ

نے لکھا

سنہ ۱۳۴۲ھ سنہ ۱۹۲۳ء

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیسویں صدی کی تاریخ دانی اور اخبار نویسی پر بدنما داغ

دورِ حاضرہ میں ہندوستان کا مطلع مہیب اور ہولناک تعصبات کے بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہندو سنگٹھن کی زبردست ہوائیں اور شدھی کی پرشور لہریں دونوں مل جل کر ہر گوشۂ ملک میں تباہ کن تلاطم برپا کر رہی ہیں۔ گستاخ اور دریدہ دہن اخبارات کی صدائے بے ہنگام ہندو سوسائٹی میں گونج گونج کر طوفانی تھپیڑے کی طرح اُن چٹانوں کو ٹکرا رہی ہے جن کی طاقت اندرونی عناد اور بیرونی عداوتوں کے جذبات کو دبانے میں کارگر ثابت ہو چکی ہے۔ تلخ بیان ہندو لیڈروں کی تقریریں پلیٹ فارم پر سیلاب کا درجہ حاصل کرتی جاتی ہیں۔ جھوٹے اور تراشے ہوئے الزامات۔ دل خراش فقرے۔ اس کی

کے ساز و سامان کو گھاس اور تنکوں کی طرح بہائے لئے جاتے ہیں
چونکہ گاندھی کے عالم خیال میں فولادی زنجیروں کی بندشوں
سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا۔ شورش پسند مضمون نگار جن کا دل
خود غرضانہ خیالات سے اُمنڈا ہوا ہے اپنے قلم سے جھوٹ اور
افترا پردازی کا سمندر بہا کر ہندوستانیوں کی جیتی جاگتی آرزوؤں
کو اس طرح ڈبو رہے ہیں کہ وہ دوبارہ نہیں اُبھر سکتیں اور
ان کے نامۂ اعمال کی سیاہی صحائف کے صفحوں پر ڈراؤنی رات
کی طرح چھائی ہوئی ہے ہندوستان ہر زمانے میں راست گو
مورخوں کی قدر کرتا ہوا چلا آیا ہے اور یورپ کے مہذب ممالک
میں فلسفۂ تاریخ کو دیگر علوم سے اسی واسطے اہم خیال کیا جاتا
کہ ایک لائق مورخ جب کسی ضروری مضمون پہ قلم اُٹھاتا ہے
تو واقعات پر روشنی ڈالنے میں صحت اور ایمانداری کو ہاتھ
سے نہیں جانے دیتا۔ گورنمنٹ ہند اُن بدنام کن اخبارات کے
رویہ کو ہمیشہ غور کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے جو دیسی ریاستوں
میں "بھیک کے ٹکڑے" کے نام سے مشہور ہیں اور جو حملہ آوری
کی فضائے بسیط میں اپنا کرۂ ہوائی قایم کر کے روشن چاند کی
طرح جگمگانے والی صداقت پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے
رہتے ہیں اور وہ والیان ملک کو ناجائز طور پر دبا کر ذاتی فائدہ
حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں انھیں منہ نہ دے۔ پر چول کرنا یا ان

بند کرنے کے واسطے گزشتہ سال مجلس لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا تھا جس پر ہندوستانی ممبران مجلس وضع قوانین و آئین کی طرف سے بہت کچھ اختلافات کی صدائیں بلند کی گئی تھیں اور اس قانون کو غیر ضروری بتایا گیا تھا لیکن حضور وائسرائے ہند نے اس کی منظوری دیدی تھی۔ افسوس کہ تمام شاہد مورخ اور غلط نگار اخبار نویس اپنے برتاؤ سے آج اس قانون کی ضرورت کو ثابت کر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں لاہور سے انگریزی اخبار ٹریبیون نے یہ خبر شائع کی تھی کہ اعلیحضرت "تاجدار دکن عنقریب اپنی حکومت سے علیحدہ ہونے والے ہیں" اس دل شکن خبر نے اُن حلقوں میں غم و غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے جن کو اس بہائی اور نفسا نفسی کے زمانہ میں ہندو اخبارات کے پیہم اور من گھڑت الزامات کا جو وہ اس ریاست اور رئیس پر آئے دن لگایا کرتے ہیں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ حضور بندگان عالی کی ذات نہ صرف اسلامی ملک بلکہ تمام ہندوستان کے قالب کی روح اعظم سمجھی جاتی ہے اگر شہزادہ کے سرکاری تار کے ذریعہ سے اس خبر کی تردید نہ ہو جاتی تو شاید اسلامی صحافت کا لب و لہجہ حد سے تجاوز ہو جاتا اور اس کی ذمہ داری تمام اشتعال انگیز مضامین شائع کرنے والے ہندو اخبارات پر عائد ہوگی اخبار ٹریبیون کے اس گوشہ سے پہلے بھی مثال ہے کہ اپنے سلسلۂ مضامین کے جو مدراس کے اخبار ہندو میں نکلا تھا اس امر کی ایک مثال قائم کر چکے تھے کہ ہمیشہ کو اعلیحضرت شہریار دکن سے للہی بغض ہے۔

سنت نہال سنگھ کا تعارف سنت نہال سنگھ ایک سکھ انشا پرداز ہیں جن کی آنکھیں یورپ کی جلوہ گاہ سے منوّر ہو چکی ہیں اور وہاں کے تمدّن اور طرز معاشرت کا نقشہ ان کے صفحۂ دل پر کھنچ چکا ہے ہندوستان کی خانگی زندگی اور یہاں کی کہنہ رسوم آپ کی مہذب روح کے لیئے زہر کی خاصیت رکھتے ہیں اس لیئے آپ نے ولایت کی ایک لیڈی کو اپنی بیوی بنایا ہے۔ یورپ کے جرائد و رسائل میں آپ کی سحر نگاریوں کی دھوم ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ غریب ہندوستان کے رسم و رواج کا مذاق اُڑایا جاتا ہے "سنت" گورمکھی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی حق شناس اور خدا آگاہ ہیں مگر آپ نے اخبار ہندو مدراس کے صفحات پر جو معرفت کے جواہرات بکھیرے ہیں وہ آپ کی ناحق شناسی اور پکی دنیا داری کا نمونہ ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ حیدرآباد کے صیغۂ تاریخ میں ایسی تنخواہ پر ملازم رہ چکے ہیں جو بڑے بڑے عہدہ داروں کو بھی نصیب نہ تھی آپ خوبصورت پرفضا بنگلہ میں رہتے تھے اور ایک شاندار موٹر میں بیٹھ کر دونوں وقت ہوائیں کھاتے پھرتے تھے۔ سکھ قوم نے انگریزوں کی ملازمت میں جو قیمتی خدمات انجام دیئے ہیں وہ برٹش حکومت کی تاریخ میں ضرب المثل بن گئے ہیں آج تک سکھ اخبارات اپنی نمک حلالی اور وفاداری کے افسانوں کو دُہرا کر خیر خواہی کی فہرست میں صف اوّلیں کا مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر سنت صاحب نے [illegible] خیالات جو زہر اُگلا ہے وہ احساس حق کے اس قدر منافی ہے

کہ کوئی سنت۔ کوئی خدا دوست شخص خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو اپنے حرکات و سکنات سے ایسا عجیب و غریب کرشمہ نہیں دکھا سکتا جو نہال سنگھ کی محسن کش طبیعت سے سرزد ہوا ہو اگر یورپ کی آب و ہوا میں یہ اثر ہو کہ وہ اچھے خاصے روحانی سنتوں کو مادہ پرستی کا دلدادہ بناکر انھیں حرص و آز کی رسیوں میں جکڑ دیتی ہو تو ہم تمام گورودوارہ وں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ "سنت" جیسے متبرک خطاب یا لقب کی حفاظت میں مصروف ہوں۔ تعجب ہو کہ سنت صاحب نے کشمیر، پٹیالہ، نابھ جیسی ریاستوں کی بدانتظامیوں کے راز ہائے سربستہ کے انکشاف کو چھوڑ کر اُس اسلامی ریاست پر پہلا وار کیا ہو جس نے ان کو قدردانی کے آسمان پر پہنچا کر چمکتا ہوا ستارا بنا دیا۔ ریاست میسور کے حالات پر بھی آپ نے کوئی سلسلہ مضامین نہ نکالا باوجودیکہ یہاں کی تاریخ لکھنے پر جس کو آپ نے خود جاکر پیش کیا تھا ریاست سے بجائے انعام اکرام کے جواب خشک ملا پھر بھی اس ریاست سے خفا ہوکر آپ کے قلم کو جنبش نہ ہوئی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا فرماں روا مسلمان نہ تھا۔ ریاست حیدرآباد نے جو اسلامی ریاست تھی آپ کی کاوش سے زیادہ مہاتماری کی جس میں ۱۵ ہزار کے قریب روپیہ کا صرف ہوتا کہا جاتا ہو اور ۲۵ ہزار بطور معاوضۂ تاریخ نویسی دیا۔ اس رقم پر آپ نے اضافہ چاہا اور اس اضافہ کی نامنظوری پر آپ کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا اور یہ خیال ہوا کہ یہ نامنظوری صیغۂ فنانس کی رپورٹ پر ہوئی جس کی وجہ سے آپ نے

صدر المہام فنانس مسٹر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ) پر اپنے مضامین میں خاص عنایت کا برتاؤ کیا کہاں حیدرآباد کی ملکی و مالی حالت کا تبصرہ اور کہاں سر علی امام اور حیدری صاحب کے پرائیویٹ تعلقات اور سیلون (ریلوے کا مخصوص ڈبہ) کے دار بہت و سنجیدہ جانے کا تذکرہ! اس طرز تحریر سے جو انھوں نے حیدر نواز جنگ کے متعلق اختیار کی ہے ان کی اندرونہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اور جس سے ان کے تمام مضامین کی نوعیت بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔

گر حسد را جا بود در دل کسی
پیلتنش اندر طعنۂ پاکان بود

یا اردو شاعر کی زبان میں یوں کہنا چاہیے

تیری ہی دیوانی کے ختن شیدا دیکھی ہے
داغ یار خدا ڈھانپ سے پردہ تیرا

سنت ہی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریاست حیدرآباد کی حکومت کی رواداری آپ جیسے تنگدل مورخ کے اعتراف کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس امر واقعہ کو کہ یہاں ہر مذہب اور ہر قوم کے حقوق کی نگہداشت ہو سکتی ہے اور یہ ریاست اپنی روایات قدیمہ کو اب تک مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ ہر عہد کے انشا پرداز، مورخ، شاعر اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور جادو بیان سخن طراز حضرت داغ دہلوی فرماتے ہیں:

شیوۂ راستی ایسا ہو کن ہیں کو داغ
بل نہیں رکھتے مسلمان سے ہندو دل ہیں

مسٹر اسے کلاڈ کیمبل نے جو یورپ میں علم تاریخ کے ماہر اور کامل تسلیم
کیئے گئے ہیں اپنی تاریخ گلیمپسز آف دی نظامس ڈومینین

"Glimpes of the Nizam's Dominian"

میں مذاہب کے باب میں حیدرآباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا مفہوم
یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام اسلامی اور ہندو ریاستوں کے مقابلہ میں
اس بات کا سہرا حیدرآباد کے سر ہے کہ وہاں مختلف مذاہب کے ساتھ
رواداری اور بے تعصبی کا برتاؤ کیا جاتا ہے (جس سے یورپ کے ممالک
کو نایاب سبق لینا چاہیئے) کیونکہ نظام کی حکومت جملہ مذاہب کے ساتھ
حقیقی معنوں میں یکساں فیاضی اور کشادہ دلی کو برتتی ہے اور وہ اس
بات کی ضامن رہتی ہے کہ مذہبی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ
کی جائے اور غیر مذاہب والوں کا رونگٹا بھی میلا نہ ہونے پائے۔
جاگیر، انعام، زمینیں، سالانہ عطیات۔ اس کے علاوہ کثیر رقموں کے ذریعہ
مختلف طریقوں سے مختلف مذاہب کی امداد ہوتی ہے مندروں اور
دیولوں کی محافظت کے لیئے اس طرح روپیہ اور زمینیں دی جاتی ہیں
جس طرح مساجد اور درگاہوں کے لیئے مندرجہ بالا تمہیدی سطور پڑھنے
کے بعد [illegible] کے سلسلہ مضامین کی علت غائی سمجھ میں آجاتی ہے کہ
[illegible] پڑھنے والوں کے [illegible] حیدرآباد [illegible]

ہندوؤں میں بغض و عداوت کی روح پھونک کر انھیں آئندہ مادی
فوائد یا دماغی روشنی سے محروم رکھنا تھا

علی گڑھ کالج پر غصہ

جس بیشتر جماعتوں کی آنکھوں میں علی گڈھ کالج کی
مہتم بالشان ہستی ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتی رہی
ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مدرسۃ العلوم کے وجود میں آنے سے پہلے اغیار
ہی ملک کی اعلیٰ ملازمتوں وغیرہ پر قابض و دخیل تھے مسلمان خواب
فراموش کے دلفریب نظارہ میں مصروف ہو کر اپنے مستقبل سے بے خبر
تھے۔ سر سید اعظم نے تنگ دل ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم تاریک خیال
اشخاص کے نزدیک یہ بڑا گناہ کیا کہ مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے جگادیا
اور شعبہ تعلیم نے مسلمانان ہند میں نئی روح پھونک کر انگریزی حکومت
میں ان کو ہر قسم کی ملکی ترقی کا حصہ دار بنا دیا اور جدید خیالات
کی روشنی میں انھیں اپنے گزشتہ اقبال کی ایک ہلکی سی جھلک نظر
آنے لگی۔ اگر خدا نخواستہ علی گڑھ کالج عالم وجود میں نہ آتا اور مسلمان
بوریا نشینی کو خیرباد کہہ کر انگریزی تعلیم سے بہرہ یاب نہ ہوتے تو
سنت جی کو آج حیدرآباد میں علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ اصحاب کو
دیکھ کر غصہ نہ آتا۔ ریاست حیدرآباد اور علی گڈھ کالج کا تعلق ایسا
ہی ہے جیسا روح اور جسم کا اگر اول الذکر ہندوستانی مسلمانوں کے
لیے کعبۂ مقصد ہے تو آخر الذکر مرکز کو مدینۃ القوم ہونے کا فخر حاصل
ہے۔ مثال [illegible] صاحب تحریر فرماتے ہیں "ایک دن جبکہ میں اپنے

دوست سے جو ریاست حیدرآباد کا ایک بڑا مشہور افسر ہے باتیں کر رہا تھا تو میرے دل میں اتفاقیہ یہ خیال آیا کہ میں اُس سے دریافت کروں کہ اُس کے کتنے ہم جولی یعنی علی گڑھ اینگلو اورینٹل کالج کے (جس کو اب مسلم یونیورسٹی کہتے ہیں) اولڈ بوائے ایسے ہیں جو نظام حیدرآباد کی ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اس کے جواب میں میرے دوست نے مجھ کو ایک لمبی چوڑی فہرست دکھائی جس میں علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتوں کا نام درج تھا جس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ریاست حیدرآباد کی کونسل کا جو ممبر خزانہ ہے وہ علی گڑھ کا گریجویٹ نہیں ہے مگر علی گڑھ یونیورسٹی کی تعلیمی کونسل کا ممبر ہے۔ محکمۂ خزانہ کا سکریٹری ایک گریجویٹ نوجوان ہے محکمۂ طبابت کا جو سکریٹری ہے وہ اُس مشہور نواب کا متبنیٰ ہے جو کئی سال تک علی گڑھ یونیورسٹی کا مشہور رکن رہا ہے۔ محکمۂ سررشتہ تعلیم کا ڈائرکٹر کالج مذکورہ کے بانی کا پوتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا پرنسپل علی گڑھ اورینٹل کالج کا طالب علم ہے۔ تقریبًا سو فی صدی نظام حیدرآباد کی ریاست کے عہدہ داران مسلمان ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے۔" سنت صاحب ایک اسلامی ریاست میں طلبائے علی گڑھ کے اجتماع سے نہایت پریشان نظر آتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس طبقہ کو حکومت اور سلطنت کی وفاداری اور اطاعت کی تعلیم خاص طور پر دی گئی ہے۔ ان کی موجودگی میں نہ کوئی پولیٹکل ایجی ٹیشن کامیاب ہوسکتا ہے اور نہ کوئی غیر آئینی تحریک سرسبز ہوسکتی ہے۔ سنت جی کے مضمون میں مسٹر راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ کا پتہ جس طریقہ سے

دیا گیا ہو اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ علی گڑھ کالج کے تمام اولڈ بوائے عہدہ دار
تھا ایک طرف تو حقیقتاً بانی کالج کے پوتے کی موجودگی سب سے زیادہ ناگوار ہو
مسٹر راس مسعود کے دادا نے مسلمانوں کی قسمت کو پستی سے اُٹھا کر بلندی پر
پہنچایا۔ دکن کے علاوہ اس وقت ہندوستان کی مسلمانوں میں جو قابل قدر
ہستیاں دکھائی دیتی ہیں وہ علی گڑھ کالج اور سر سید اعظم کی جانفشانیوں
کے ثمرات ہیں جنھوں نے غیر اقوام کے مقابلہ میں اعلیٰ فتوحات حاصل کی ہیں
گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری میں ریاست حیدرآباد اور علی گڑھ دونوں شہرۂ آفاق
ہیں جب کبھی سلطنت کو مشکلات پیش آتی ہیں تو دونوں کا رخ قطب نما کی
طرح امداد کی جانب پھرا ہوا ہوتا ہو جس طرح کلائیو کو یہ فخر تھا کہ اس نے ہندوستان
میں انگریزی سلطنت کی بنیاد قائم کی اسی طرح ان دونوں کو حکومت کی بنیاد
مستحکم کرنے کا فخر حاصل ہو۔ یہ دو مقدس فرشتے ہیں جو نازک موقعوں
پر اطمینان کا ہاتھ دراز کرکے امن کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی آواز
سے شور و شر کے فتنے زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ ریاست اور کالج دونوں
کے خیالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہو کہ وہاں مسلمانوں کو امن کی
جانب تعلیم دی جاتی ہو اور ان کے دل پر نقش بٹھایا جاتا ہو کہ شور و شر میں
حصہ لینا احکام اسلامی کے خلاف ہو۔ دشمنان اسلام ان دونوں کو اچھی نگاہ
سے نہیں دیکھتے اور ان کی ہستی کو اپنے واسطے انقلابات اور کارروائی میں سب سے
زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ یہ غلط الزام ہو کہ ریاست حیدرآباد کے عہدہ داروں
میں [illegible] مسلمانوں سے مساوی برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ ایک واقعہ ہو کہ [illegible]

جو ریاست کے قدیم وفادار اور روایات کو قائم رکھنے کے اہل ہیں بلکہ وہ ریاستی ہو
علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے طلبا اپنی اعلیٰ قابلیت اور سمجھداری سے ریاست کی بہبودی
اگر اس معیار میں کوئی شخص پورا اترے تو وہ [illegible] سے [illegible] اور [illegible] پر [illegible] کا
بتایا گیا ہو پورے اترتے ہیں تو فرمان روائے ریاست نے پہلو [illegible] اعتراض [illegible]
تھا۔ اور ریاست بھی اعلیٰ حضرت کی فراست پر دال ہو کہ وہ [illegible] سے
خیالات کے تعلیم یافتہ گروہ کو پسند نہیں کرسکتے۔

مشہور مسلمانوں کے سوانح اور تاریخ نگاری

ہمیں یہ معلوم ہے کہ [illegible] اور [illegible] کی تاریخ نگاری
کے نقش پر [illegible] ہوئے تھے تو آپ آصف جاہ اول
قمر الدین خاں بہادر بانی دولت آصفیہ کے عہد سے بالکل ناواقف ہیں کیا
آپ شمس العلماء مولوی [illegible] کے نام نامی سے [illegible] پر فاتح ہو کر اپنے [illegible]
پہنچے تھے کہ ان کی حالت اس مورخ کی طرح ہو گئی کہ [illegible] ریاست ایک
طرف [illegible] دوسری طرف اپنی [illegible] میں اس طرح [illegible] ہو سکے

پھر آئے کس طرح عالم کی نظر میں | [illegible]
ترتیب کا جامہ [illegible] | [illegible] کے [illegible]

انسان کیا ہمیں تو فرشتے کا ہے پتا
راوی کے آپ [illegible] میں [illegible] کا نام تھا

کچھ ان کا بیاں کہ جو دنیا کے ہادی تھے | کچھ [illegible] کہ [illegible] تھے
کچھ [illegible] کا حال کبھی قوم کی صفات | یہ علم اور یہ [illegible] مورخ کی [illegible] ہے
پھر کہیں کا حال بتاؤں [illegible] کا حال | لیکن نہیں [illegible] کا یہ خیال

تاریخ کے اوراق شہادت دیتے ہیں کہ شاہان دکن ہمیشہ اپنے جانشینوں کو یہ نصیحت کرتے رہے ہیں کہ "شبانہ روز اپنے نفس کا محاسبہ کیا جائے لوگوں کی حقوق تلفی نہ کی جائے اور مروت کا لحاظ رکھا جائے" دولت آصفیہ کے بانی غفران مآب آصف جاہ اول جن کی شجاعت اور بہادری کو دنیا کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں انھوں نے ۱۱۳۳ھ میں دکن کو فتح کیا تھا۔ اس زمانہ سے اب تک ہندوؤں کے ساتھ مراعات کی جاتی ہیں اور ایک مبصر ہندو مسلمانوں کو یک جان دو قالب دیکھ کر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اگر مساوات اور جمہوریت کی سچی تصویر کہیں موجود ہے تو وہ دکن کی سرزمین پر ہے جہاں دو سو پانچ سال سے ابتک اتحاد کے شاندار نظارے نظر آتے ہیں اور اگر ایک مسلمان کے دل میں درد اٹھتا ہے تو تمام ہندو اس کی آواز میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دکن کے صلح کل اور غیر متعصب فرماں روا دونوں قوموں کو سلطنت کی گاڑی کے دو پہیے سمجھتے رہے ہیں اور نظام حکومت میں دونوں کو برابر کے حصے دیئے گئے ہیں۔ زمانہ حاضرہ میں جو ہندو رئیس۔ امیر، تعلقدار، راجہ موجود ہیں ان کے آبا و اجداد نواب آصف جاہ کے ساتھ دکن میں آئے تھے جن کو لاکھوں روپیہ کی جاگیریں اور مناصب دیئے گئے اور وہ عہد ماضیہ سے ابتک اعلیٰ خدمات پر سرفراز کیئے جاتے ہیں اور نسلاً بعد نسلاً ان کے اعزاز کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر جو پیشکاری کی موروثی خدمت پر مامور اور تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ کی جاگیر کے مالک ہیں ان کا نام سول لسٹ میں صدر اعظم کے نام سے پہلے درج ہوتا ہے

جو بے تعصبی کی ایک روشن مثال ہے۔ صرف خاص کا سارا انتظام ایک ہندو عہدہ دار کے ہاتھ میں ہے۔ مہاراجہ نریندر پرشاد اور مہاراجہ چندو لال کی وزارتیں تاریخ آصفیہ میں ہندو مسلم اتحاد کا نشان دیتی ہیں رائے رایان راجہ شیو راج دھرم ونت بہادر اور راجا راؤ بہادر کے خاندان کی عظیم الشان جاگیریں صاف بتا رہی ہیں کہ ریاست حیدرآباد مذہبی تعصب سے پاک صاف ہے۔ اگر سنت صاحب الصاف کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھا کر دیکھیں تو انھیں دکن کے راجوں کی فہرست میں یہ نام نظر آئینگے۔

مہاراجہ صاحب گدوال۔ مہاراجہ صاحب جٹ پول۔ مہاراجہ صاحب ونپرتی۔ راجہ صاحب اناگندی۔ راجہ صاحب ڈوم کنڈہ۔ راجہ صاحب پیٹ۔ راجہ صاحب سرنا پلی۔

ان کے سوا دکن کے ہر گوشہ میں بہت سے ہندو ہیں جو سرچشمہ ریاست کی فیاضی سے سیراب ہو رہے ہیں اور انھیں لاکھوں روپیہ کی جاگیریں دی گئی ہیں۔ پھر جاگیرداروں کی "دیہی قومی حکومت" ایک ایسی شاندار چیز ہے جو انھیں ترقی کے اعلیٰ زینہ پر پہنچا کر ہندوستان کے قدیم تمدن کی نگہبانی کر رہی ہے۔ سنت صاحب نے دنیائے تعصب کا بہادر کپتان بن کر ریاست کی سول لسٹ کو اپنا نشانہ بنانا چاہا ہے۔ اگر ریاست میں قومی تفریق کا شبہ بھی موجود ہوتا تو ایک غیر مسلم کو صدر اعظم کا عہدہ نہ دیا جاتا جن کی بابت مضمون نگار صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "آنریبل نواب فریدوں ملک بہادر ایک پارسی جنٹلمین ہیں جو اردو زبان اچھی طرح سیکھ گئے ہیں اور رہر جمعہ کو مسلمانوں کی جماعت میں

شامل ہوتے تھے مصنف صاحب کے مذکورہ بالا فقرہ میں ہر جمعہ کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ کوئی جمعہ خالی نہیں جاتا کہ وہ مسجد میں تشریف نہ لے جاتے ہوں حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے جمعہ کی نماز میں ہزاروں مسلمان جامع مسجد کے اندر جمع ہوتے ہیں اور اسلامی دنیا میں غیر مسلم اشخاص سیر و تفریح کی غرض سے اس نظارہ کو دیکھتے ہیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اگر کبھی کسی موقعہ پر سر فریدوں الملک صاحب نے بھی کہ مسجد کا منظر دیکھا ہو تو کیونکر قابل اعتراض ہو سکتا ہے

ریاست کے ہندو عہدہ دار — اب ذرا کسی قدر تفصیل سنتا ہوں کہ حیدرآباد کے عہدہ داروں میں تقریباً ۸۰ فیصدی مسلمان ہیں۔ کوئی [illegible] سول لسٹ میں چوٹی کے غیر مسلم اور ہندو عہدہ داروں کے نام پڑھتا ہے تو وہ مصنف صاحب کے [illegible] پر [illegible] نہیں رہ سکتا غیر مسلم عہدہ داروں کے نام ملاحظہ ہوں:

نواب فریدوں الملک بہادر [illegible]
راجہ [illegible] بہادر [illegible] مدار المہام
[illegible] کشن [illegible]
مسٹر [illegible] صاحب [illegible]
مسٹر [illegible] رکن [illegible]
مسٹر [illegible] (رکن [illegible])

مسٹر [illegible] صاحب [illegible]
مسٹر گریفن صاحب [illegible]
مسٹر [illegible] صاحب ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل [illegible]
مسٹر [illegible] صاحب [illegible]
مسٹر [illegible] صاحب جج عدالت العالیہ

[illegible] | مصنف صاحب نے [illegible]

چند ہندو [illegible] کے نام لکھے ہیں اور اس کو نئی بات [illegible]

کیا ہوگا لیکن شاید [illegible] کے [illegible] کا آپ کو علم نہ ہو ورنہ اس کے

جاننے کی آپ نے ضرورت [illegible] آپ کی [illegible]

[illegible] آپ نے لکھے ہیں [illegible] سے پاک نہیں مثلاً جہاں آپ نے

[illegible] صاحب کا اور ان کی [illegible] کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی لکھا

ہے کہ آپ کے [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] صاحب سرفراز ہیں [illegible] صاحب کو [illegible]

[illegible] سے ملقب کرتا [illegible] کی ذلیل ہے اور [illegible] ان کو

[illegible] آپ نے [illegible] اپنا [illegible]

[illegible] والوں [illegible]

کی [illegible] گوارا کرے تو [illegible] معلوم [illegible]

[illegible]

[illegible] کثرت سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کی وضع میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا قریب قریب تمام دفاتر کے اہلکار بلا لحاظ
ہندو مسلم شیروانی اور دفتری دستاریں ملبوس نظر آتے ہیں۔ اور دفتر سے باہر
ہندو ترکی ٹوپی بھی پہنتے ہیں وہ یکسانیت ہے جس سے دکن میں ہندو مسلم کے
باہمی اتحاد کا پتا چلتا ہے۔

تعلیمی وظائف کے متعلق سنت جی کا اعتراض

سنت جی کہتے ہیں کہ یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جو وظیفے دیئے جاتے ہیں ان میں ہندوؤں کو بہت کم حصہ ملتا ہے آپ نے اپنی یاد پر زور دیکر ان وظائف کا تناسب ایک اور دس کا بتایا ہے، محکمہ تعلیمات سرکار عالی کی رپورٹیں شاہد ہیں کہ ہندو طلبا کی تعداد مدارس میں مسلمانوں کی بہ نسبت کم رہتی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہندو اپنے اُن موروثی پیشوں کی وجہ سے جو آمدنی کے لحاظ سے ملازمت سے بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں عموماً تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے اور بچوں کو مدرسہ میں بھیجنے کی جگہ ابتدائی عمر سے موروثی پیشہ میں لگا دیتے ہیں جب ملکی تعلیم میں جو آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے ہندوؤں کی یہ حالت ہے تو سمندر پار جاکر اور خاصکر ایسی حالت میں جبکہ چھوت چھات کا مسئلہ جزو مذہب ہو وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بچوں کو یورپ کیوں بھیجنا پسند کرینگے. گزشتہ ۱۷ سال میں جس قدر درخواستیں یورپی وظائف کے لیئے محکمہ سرکار کو موصول ہوئیں اس میں ہندوؤں کی تعداد کا اوسط ۱/۳ سے کم تھا البتہ اگر صرف تین چار سال گزشتہ کا اوسط لگایا جائے تو ۳۳ فی صدی کا اوسط ہو جاتا ہے۔ چونکہ ان وظائف کے پانے والے طلبا بھی جب وہ ولایت سے

فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں دکن میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز کیے جاتے ہیں اس لیے حصول وظایف کی فہرست میں ہنود کا مذکورہ بالا تناسب معلوم ہو جانے کے بعد صرف یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وظایف کی مد میں اہل ہنود کی تعداد کا کم ہونا اعلیٰ حضرت تاجدار دکن خلد اللہ ملکہ کے تعصب اور ہندو مسلم تفرقے کے سبب نہیں ہے بلکہ خود ہندوؤں کی بے پروائی اور ان کی پابندی مذہب اس کا باعث ہے اسی کے ساتھ یہ معمّا بھی حل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر ہندو کیوں کم تعداد میں ممتاز ہیں۔ جب وظایف کے متعلق بھی سنت جی کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے تو ہمارے اس خیال کو پوری تقویت ہوتی ہے کہ سنت جی کے مضامین کی اشاعت کا مقصد ریاست کی اصلاح نہ تھا بلکہ اپنے انتقام پسند طبیعت کی جولانی کا دکھانا منظور تھا۔

علامہ ابن خلدون کے نزدیک ہر واقعہ کی ایک خاص طبیعت ہوتی ہے کسی مضمون پر نقد و تبصرہ کرنے والا شخص غور و خوض کی مدد سے طبیعت کو پا جاتا ہے مگر سنت جی صاحب جنہوں نے ریاست حیدرآباد کو بدنام کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا ہے ان کو تعصب کی طوفانی آندھی میں تعداد وظایف میں ہندوؤں کی کمی تو نظر آئی لیکن انہوں نے یہ کھوج نہ لگایا کہ ہندو والدین کا اپنے بچوں کا تعلیم کے لیے ولایت بھیجنے کے متعلق عموماً کیا خیال ہے جس گروہ میں علم کی طرف سے عام بے شوقی ہو اس کو وظایف کی ترغیب بھی علم کی خاطر ہندستان سے باہر بحری سفر پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ عہد حاضرہ میں دنیا کی قومیں ترقی کی جولانگاہ میں قدم اٹھا رہی ہیں لیکن حیدرآباد کے خوش حال ہندو اسی پرانی لکیر کے فقیر ہیں اور ہندوستان کے

ہندوؤں کی طرح مذہب سے آزاد ہوکر دنیوی ترقی کو ضروری نہیں سمجھتے اور ریاست سے اُن فیوض سے جو بلا تفریق مذہب و ملت جاری ہیں بہرہ مند ہونے کی کوشش نہیں کرتے تو اس میں حکومت کا کیا قصور ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اورنگ زیب ثانی سنت جی اعلیٰ حضرت پر تعصب کا الزام لگاتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ میں نے ریاست حیدرآباد میں دیکھا۔ یہ سارا معاملہ ایک مولوی صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے جنہوں نے حضور کو اسلام کی تعلیم دی تھی اور آپ اس وقت بالکل بچے تھے۔ آپ کے دماغ میں ابھی کسی قسم کا کوئی اثر نہ تھا۔ مولوی صاحب کو موقعہ ہاتھ آگیا اور آج جو ہم دیکھتے ہیں یہ مولوی صاحب ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یعنی وہ اسلامی بیج جس کو مولوی صاحب نے اپنے ہاتھوں ریاست حیدرآباد کی زمین میں بویا تھا آج صرف بڑا نہیں ہوگیا بلکہ ثمردار بھی ہے اور وہ میٹھا پھل لا رہا ہے جس کی بدولت ریاست کے سیکڑوں اور ہزاروں مسلمان عیش کر رہے ہیں بیان کیا گیا ہے کہ اس مولوی نے متعدد بار قسم کھا کر یہ الفاظ استعمال کیے تھے کہ "میں نے اورنگ زیب ثانی پیدا کردیا ہے" میں نے ایک دفعہ نظام سے یہ عرض کردیا تھا کہ آپ صرف مسلمانوں ہی کے آقا نہیں بلکہ ان تمام ہندو اور سکھوں کے بھی مالک ہیں جو آپ کے جھنڈے تلے پرورش پا رہے ہیں"

ہم نہایت مسرت سے مضمون نگار صاحب کا یہ اعتراض اسلامی تاریخ کی کم واقفیت پر مبنی ہے۔ اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ بادشاہ وقت مسلمان

عیسائی، سکھ وغیرہ سب رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ کیجئے۔ آنحضرت پختہ
مسلمان ہیں اور وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مذہب انسانوں کو باہمی
محبت سکھاتا ہے۔ جو شخص اپنے مذہب میں پختہ ہے وہ تمام مخلوق کو پیار کرتا ہے اور
سچی انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ بیشک اورنگ زیب اپنے مذہب میں نہایت پکا
تھا مگر برادران وطن متعصب انگریزی مورخوں کے اقتباسات کو پڑھکر جو نتیجے
نکال رہے ہیں اس کو دور موجودہ کی تاریخی دریافت ماننے کے واسطے تیار نہیں
ہے۔ جدید تحقیقات نے اس مسئلہ کو بخوبی صاف کر دیا ہے کہ اورنگ زیب کی
حکومت عدل و انصاف کے حدود سے باہر نہ تھی اور اس نے اپنے زمانہ میں
قوموں کی آزادی کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی۔ ہندوستان کے دیگر
مسلمان بادشاہوں نے جو مراعات دیگر قوموں کے ساتھ برتی ہیں وہ سب
اورنگ زیب سے پیچھے ہیں۔ اس وقت جو لوگ اورنگ زیب کے مظالم کا
افسانہ نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں وہ ایک تاریخی غلطی میں مبتلا ہیں۔ یورپ
کا مشہور مورخ لین پول رقم طراز ہے کہ اورنگ زیب کے پچاس برس کی دراز
حکومت میں ایک ظالمانہ فعل بھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہوتا اور ہندو
پر حکومت کرنے میں نہ اس نے قتل کیا اور نہ کسی کو جسمانی تکلیف پہنچائی۔ ایک
آزاد نگار یورپین مورخ کا یہ بیان ان لوگوں کے لیئے تازیانہ سے کم نہیں ہے
جو اورنگ زیب کی سیاسی قابلیت کے بے داغ مرقع میں مخالفت کا رنگ
کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں اور اس کی تصویر کو خونخوار بنا کر تاریخی دنیا کے
سامنے پیش کرتے ہیں۔ اورنگ زیب کے متعلق یہ واقعات جو مشہور ہیں کہ

اس نے دکن کی ریاستوں کو مٹا دیا۔ ہندوؤں پر طرح طرح کے قہر ڈھائے۔ بہت خانوں کو مسمار کیا۔ مرہٹوں کو چھیڑ کر سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ یہ تمام حالات اُن مورخوں کی من گھڑت ہیں جو ہندوستان کی دو قوموں کے بین منافرت پھیلانی چاہتے ہیں اور تعصب کی خراب اور برباد کن عنصر نے ان روایات کو ہر عہد میں تازہ کرتا چاہا ہے۔ الین پول ایک دوسرے موقع پر تحریر کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے دنیا کی راہ اپنی ایمانی طاقت سے مسدود کر دی تھی اُس نے اپنے ادائے فرض کی راہ نکالی تھی۔ اس نے اپنی روح کو مجبور نہیں کیا اور علم عقائد کو پیٹھ نہ دکھائی۔ ہندوستان کا جو شہدا پر اعظم ایسے مادہ کا شخص تھا جس کے سر پر شہدا کا تاج زیب دیتا تھا، گو مہاراجہ جسونت سنگھ کے بیٹے کو اورنگ زیب نے قید کیا تھا مگر اس کے لڑکے اور ماں کا خیمہ خیمہ شاہی کے ساتھ ساتھ استادہ کیا گیا تھا جب سنبھاجی پسر سیواجی شاہی دربار میں آیا اور اس نے کھانا ترک کر دیا تو اورنگ زیب کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا گیا کہ تم قید میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہو اس لیئے تم کو بے تکلف کھانا چاہیئے۔ رحم اور انصاف کی ایسی مثالیں اُسی حکمران کی ذات میں مل سکتی ہیں جو اپنے مذہب کا سختی سے پابند ہو اور انسانی حقوق کا لحاظ رکھتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے مساجد اور خانقاہوں کے ساتھ ہنود کے بے شمار مندروں کو امداد عطا فرمائی ہے جس کا ذکر روشن خیال اور بے تعصب ہندوؤں کی تصانیف اور شاہنشاہ مذکور کے دستخطی فرمانوں میں موجود ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت شہریار دکن کے دست راست نے واقعی ایسا کہا ہے کہ "میں اورنگ زیب

ثانی پیدا کر کے چھوڑو نگا، تو انھوں نے اورنگ زیب کے مذکورہ بالا اوصاف
کو مدنظر رکھ کر کہا ہوگا ان کے سامنے متعصب ہندوؤں والا اورنگ زیب ہرگز
نہیں ہو سکتا اس لیئے اورنگ زیب کا نمونہ گردانے کے قول کو اگر صحیح بھی مان
لیا جائے تو اعلیٰ حضرت کے اُستاد کی نیت ہرگز نہیں ہوسکتی کہ وہ ان کو
تعصب اورنگ زیب دلی کی تعلیم دیں۔ اور ہندوؤں کے برخلاف جذبات کو برافروختہ
کریں بلکہ ان کا دلی مقصد یہ ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کی فیاضی اور مذہبی
پابندی کی نظیریں پیش کر کے شاہی دل میں ایسے خیالات پیدا کریں جو تمام
رعایا کے لیئے کامیابی اور ترقی کی راہ نکالیں سنت جی تاریخ دانی کے مدعی
ہو کر بھی اورنگ زیب کی بابت خواب پریشان دیکھ رہے ہیں اور انھیں
آج تک یہ علم نہیں ہو کہ غیر مسلم ماہرین علم تاریخ نے بھی اب برسوں کی ورق
گردانی کے بعد جس طرح یہ طے کر لیا ہو کہ مسلمانوں پر کتب خانۂ اسکندریہ کے جلا دینے
کا الزام غلط ہو اسی طرح اورنگ زیب کے متعلق جو الزامات گھڑے گئے ہیں
ان کی قلعی بھی کھل چکی ہو۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندروں کو جس قدر
جاگیریں دی تھیں وہ اب تک دکن میں ہندوؤں کے پیشوایان دین کی
معاش کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اگر اعلیٰ حضرت شہریار دکن نے بھی اسی طرح اسلامی
مساجد اور اسلامی خانقاہوں کے علاوہ دیولوں کو نقود اور اراضیات کے
عطایا منظور فرمائے ہیں اورنگ زیب کی تقلید کی تو ایسے اورنگ زیب کا خطاب
ان کے لیئے کیوں ناموزوں خیال کیا جا سکتا ہو اعلیٰ حضرت کی عطیات صرف
ان ہی میں محدود نہیں ہیں بلکہ علاقہ سرکار عظمت مدار کے پجاری۔ برہمن وغیرہ بھی

اس زمرہ بادی میں شمار کئے جاتے ہیں۔ علاوہ انگریزی واقعہ ہوا۔ اس کے مشہور تیرتھ بھدراچلم کی بابت کے انتظامات اسی ریاست کی جانب سے ہوتے ہیں اور اس کام کے لئے تقریباً ۸ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم عنایت ہوتی ہے۔ صرف خاص میں سے بھی تقریباً ایک ہزار سالانہ ہنود کے تہوار کا سامان کیا جاتا ہے۔ جاگیرداروں کی سالانہ آمدنی کئی ہزار تک پہنچ گئی ہے جن میں جاگیرداران مذہبی کی تعداد تقریباً پچاس بتائی جاتی ہے۔ کیا ان حالات کی موجودگی میں کوئی شخص کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ ریاست حیدرآباد میں ہندو مسلم کی تفریق موجود ہے؟ مشہور مورخ ابن خلدون نے چند روز مراکش میں قیام پذیر ہو کر وہاں کے باشندوں کو اپنا شیدائی بنا لیا تھا مگر اس کے برخلاف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج حیدرآباد ہی کے ایک سنت نہال سنگھ کی افترا پردازیوں سے متنفر ہو کر انھیں بُری طرح یاد کر رہی اور دکنی باشندوں کی جانب سے ان کی تردید میں طول طویل مضامین نکل رہے ہیں۔ مورخین کی تحریر کو خدا نے یہ طاقت دی ہے کہ وہ اپنے قلم کے ذریعے شورشوں کو رفع کر دیتے ہیں لیکن سنت جی حیدرآباد کے ہندوؤں کو جادہ مستقیم سے ہٹا کر انھیں ایک غلط راستے پر لیجانے کے لئے کوشاں ہیں مگر حیدرآباد کی ہندو رعایا ایسی ناسمجھ نہیں ہے کہ وہ ان کی رہنمائی کو قبول کرے بلکہ ممالک محروسہ کے ہندو بزرگوں میں ایسی مقدس ہستیاں پائی جاتی ہیں جو حتی الامکان عوام ہندوؤں میں اس فاسد مادے کو نہ پنپنے دیں گے۔

ریاست حیدرآباد میں مختلف مذاہب کی آبادی

فی الحقیقت حیدرآباد میں مختلف مذاہب و فرقے آباد ہیں اور حکومت بلا تفریق مذہب اسی طرح

اُن کو حقوق دیتی ہو جس طرح ترکی سلطنت میں یہودیوں اور دیگر غیر مذہب
کی آزادی حاصل ہے۔ یہ لوگ ہر قسم کے عہدوں پر سرفراز کیے جاتے ہیں۔ عیسائی
ہندو مسلمان پارسی وغیرہ تمام مذاہب آزادی سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عیسائی
مذہب والوں کی فی ہزار ۲۸ تعلیم یافتہ ہیں جو کچھ مشنریوں کی لگاتار کوشش بتائی
جاتی ہے۔ پچھلے طبقے ہندو کی تعداد صرف ۲۴ فی ہزار ہے۔ پارسیوں کی آبادی دیگر
قوموں کے مقابلے میں بہت کم ہے مگر وہ علمی میدان میں سب سے آگے ہیں اور ان
کے خواندہ اشخاص کی تعداد ۶۰۰ فی ہزار ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہندو فی ہزار ۶ اور
مسلمان ۵ فی ہزار ہیں۔ ان شمار و اعداد میں طبقہ ذکور و طبقہ اناث دونوں داخل
ہیں۔ لیکن پنڈت جی نے اس اعتراض کا کہ ملازمتوں میں ہندو مسلمانوں کا تناسب
ٹھیک نہیں جواب دیتے ہوئے کہا جنس ذکور و اناث کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ
اعداد معلوم کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ ۱۹۲۱ء کی رپورٹ مردم شماری یہ
بتاتی ہے کہ طبقہ ذکور میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کی تعداد ۱۴۰ فی ہزار، اناث کی ۲۷ فی ہزار
ہے اور مسلمان مردوں کی تعداد ۱۲۰ فی ہزار اناث کی ۲۵ فی ہزار ہے۔ یہ اعداد و شمار
ہندوؤں کی برتری اور مسلمانوں کی تعلیمی دلچسپی کا ثبوت ہیں جس طرح ترقی تعلیم میں
عیسائیوں کو مسلمانوں پر ترجیح ہے اسی طرح پارسی عیسائیوں پر فوقیت پا کر اپنے
علمی دائرہ کو وسیع کرتے جاتے ہیں۔ پنڈت جی کا ہندوؤں کی جہالت کو حکومت
کے تعصب سے منسوب کرنا اصول و قواعد منطق کے خلاف ہے جس طرح ایک نو
مشق ملاح کو ہوا کے موافق اور ناموافق ہونے کی خبر نہیں ہوتی اور اسے کشتی
چلاتے جانے کے وقت یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس بندرگاہ کی طرف جا رہا ہے۔

اسی طرح سنت جی صاحب کا احسان فراموش قلم آئین پائیں شاہانِ آصفیہ
للہ کر تاریخ دانی کی اہانت کر رہا ہے کاش ان کو یہ معلوم ہوتا کہ دکن کی رعایا کا ہندو
حصہ زیادہ تر زراعت و دیگر زرفشاں پیشوں میں مصروف ہے یعنی ۹۰ فی صدی
ہندو کاشتکار ہیں اور تاجروں کا شمار خاص بلدہ میں ۹۰ اور اضلاع میں ۹۹
فی صدی ہے۔ اور اس لیے ہندوؤں کا کثیر حصہ ملازمت میں داخلہ کی غرض سے
تعلیم سے خود کو مستغنی سمجھتا ہے ورنہ حکومت کی طرف سے تعلیم اور ملازمت کا دروازہ
تمام رعایا پر بلا قید مذہب و ملت کھولا ہوا ہے۔ اگر سنت جی اس حقیقتِ حال پر غور
فرماتے تو ایسے لاعلاج دماغی مرض میں مبتلا نہ ہوتے۔

سرکاری ملازمت پر ملکی زبان کا اثر صوبہ مدراس کی آبادی میں صرف
۲۲ فی صدی مسلمان اور ۸۸ فی صدی ہندو شامل ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کی عام تعلیمی
حالت کا مقابلہ کرنے سے پایا جاتا ہے کہ فی ہزار ۱۷۴ مسلمان خواندہ ہیں اور ہندو
تعداد میں ۵۰ فی ہزار تعلیم یافتہ ہیں لیکن مدراس کی گورنمنٹ کے ماتحت ملازمتوں
میں ہندو مسلمان کا تناسب اُن کی عام تعلیمی حالت کے لحاظ سے بالکل بیگانہ
ہے کیونکہ وہاں کی عدالتی اور دفتری زبان انگریزی ہے اور مسلمان اس سے بے بہرہ
اس لیے وہ ملازمت سرکاری میں بہت کم ہیں جیسا کہ دکن میں سرکاری زبان
اُردو ہے اور اس زبان کو نہ سیکھنے والا قدرتی طور پر نقصان میں رہتا ہے۔

حیدرآباد نے اُردو کی سرپرستی کیوں کی؟ اُردو وہ زبان ہے جو سلطنتِ اسلامیہ میں خیالی قلمرو آزادی کا دلچسپ
نتیجہ ہے جس کے ملک کی عام زبان بن گئی اور ہندو مسلم اتحاد نے
[illegible] اس کا لٹریچر مرتب کیا۔ ہندوستان کی تہذیب و روایات اور ملکی

طریقۂ معاشرت سے آگاہی حاصل کرنے اور سوسائٹی میں داخل ہونے کے لیئے
انگریزوں کو بھی اردو سیکھنی پڑی اور چند ہی روز میں یہ زبان تمام ہندوستان
میں رائج ہو گئی جب تک کسی ملک میں قومی زبان نہ ہو وہ ترقی کی معراج
کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ جاپان اسی واسطے مہذب ملکوں کا ہم زانو ہے کہ وہاں
تمام علوم و فنون مادری زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ یونان کی دانش آرائی کی
بنا یہی تھی کہ وہاں سقراط، ارسطو، افلاطون وغیرہ نے قومی زبان میں تعلیم دینے
کے فتوے صادر کیئے تھے۔ مصر کو تاریخی دنیا میں اسی لیئے فروغ حاصل ہوا کہ اس
کے تمام علوم قومی زبان میں محفوظ تھے۔ ایران کے اقبال کا پرچم بھی قومی زبان
کے وسیلے سے لہرایا۔ ایشیا کے مشہور اور قدیم ملک چین نے دنیا میں اپنی خاص
زبان کی بدولت صنعتی ہمہ گیری حاصل کی اور کیا نقشہ ہے سے دنیا سیاہی کا سینہ
بتایا۔ عموماً بغداد، کوفہ، بخارا، قرطبہ، غرناطہ کی تباہی کا باعث اور خصوصاً دہلی کا گذشتہ
اقبال۔ زبان کی ترقیوں پر منحصر تھا۔ اقوام یہ شانہ عرب میں آصف جاہ سابع نے اپنی
مملکت میں فارسی کی جگہ اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دیا کیونکہ اردو اس
زمانہ میں ملک کی عام زبان ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکی تھی۔ برادران وطن
اپنی غلط فہمی سے اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں اور تنگ دل اور متعصب
لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس زبردست مخالفت کے ہوتے ہوئے بھی
وہ برابر نشو و نما کی راہ سے ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے۔ مسلمانوں نے زبان اور
علوم کے ساتھ کبھی ایسے بخل کو روا نہیں رکھا ہے جس کا ہندوستان کی مشترکہ
قومیت پر ناگوار اثر پڑا ہو۔ اسلامی عہد میں سنسکرت اور بھاشا کی تصنیفات

ترجمے ہوتے رہے بھاشا کی زبان کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں۔
سلطنت مغلیہ کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان، ملک محمد جائسی، عبد الرحیم خان
خاناں، خواجہ ... ملا نبی، شیخ شاہ محمد السان، آزاد بلگرامی، سید رحمت اللہ
وغیرہ۔ یہ سب وہ بزرگوار تھے جنہوں نے ہندی بھاشا میں اپنا زور قلم دکھایا
اور اپنی سخن آفرینی کی وجہ سے ہندوؤں کے سوشل نظام اور قدیم تمدن کو
اس وقت تک زندہ رکھا اور پھر پرکاش الٰہی کتابیں اب تک ہندوؤں کے
کتب خانوں میں موجود ہیں یہ ہیں مسلمانوں کے علمی کارنامے جن کی وجہ سے یورپ
کے منصف مزاج مورخوں کو یہ کہنا پڑا ہے کہ اقوام عالم میں مسلمانوں سے
زیادہ کوئی دوسری قوم بے تعصب اور علم دوست نہیں ہو سکتی۔ دکن کی
سرزمین سے اردو کی سب سے پہلی شعاع روشن ہوئی ہے جس کی وجہ
سے وہاں کے کاروبار میں اس زبان کو قدرتی طور پر دخل ہے اور وہاں
مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں اس زبان کے خواص و رموز سے بخوبی
واقف ہیں۔ سول سروس والے امتحان میں ہندوؤں کی کامیابی اور اردو زبان
پر عدم توجہی کے دو سبب قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ آجکل
شمالی ہندوستان میں برادران وطن نے اس بات کو اپنا فرض سمجھ لیا ہے
کہ وہ اردو کو جو ہندو مسلم اتحاد کی تاریخی یادگار ہے مٹا کر دقیانوسی اور دیوتاؤں
کی مردہ زبان کو زندہ کریں چنانچہ اردو کی عالمگیر طاقت کو فنا کرنے کے واسطے
نئی نئی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور ایک مشترکہ زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان
قرار دیکر ہندوستان کی قومیت کو بہت پیچھے ہٹایا جا رہا ہے۔ ہندوستانی

اُردو خارج ہو چکی ہے۔ گو عام ہندوؤں کے تعصب کی ایسی حالت نہیں ابھی تک ہنوز یہ نوبت نہیں پہنچی ہے مگر ان ہونہار لوگوں جیسے حاجی نہری کی [illegible] اور سنت نہال سنگھ کے افراد پرواز مضامین پڑھ کر ان کا اُردو زبان کی طرف سے اپنی بے پروائی ظاہر کرنا بعید از خیال نہیں۔ سنت جی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ دفاتر کے عام کاغذات میں اُردو زبان جاری ہو اس لئے ضرورت داعی ہوئی ہے کہ ایسے اشخاص کو مقرر کیا جائے جو اس زبان سے اچھی طرح واقف ہوں" سنت جی نے یہ خیال کیا کہ اُردو زبان سے واقفیت تو ہے ہی اگر یہ کسی کا قصور ہے کیا اُردو ہمارے [illegible] خاص قوم کی ملکیت ہے؟ اُردو کوئی مشکل زبان نہیں اس میں عام ہندوستانی زبانوں کے الفاظ ہیں جس زبان کی اٹھان دکن سے ہوئی ہو جس کو دو قوموں نے اپنے باہمی میل جول سے ترقی دی ہو اس زبان سے دکن کے ہندو کا اچھی طرح واقف ہونا کچھ بھی دشوار نہیں اور وہ امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی طرح پڑھے لکھے عہدوں پر مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ جیسے سنت جی گورمکھی زبان جانتے ہیں ساتھ ہی پنجابی زبان کو بول سکتے ہیں اور بے تکلف لکھ پڑھ سکتے ہیں ایسے ہی دکنی ہندوؤں کے لئے اُردو دانی بھی دشوار طلب نہیں مگر سنت جی نے اپنے مضمون میں ایسا سادہ زبان کو بدرجہا مشکل سمجھا یا ذہن کو پیچ میں ڈالنے والی پہیلی بنا کر پیش کیا ہے اُردو زبان کے ساتھ دکن کے ہندوؤں کی بے اعتنائی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نظام کالج اور سٹی کالج میں تو ہندوؤں کی تعداد بھی قابل لحاظ [illegible] لیکن جب سے اُردو زبان میں مغربی علوم کی تعلیم دیئے جانے کی غرض سے جامعہ عثمانیہ

کا افتتاح ہوا اور اس کے ماتحت مدارس فوقانیہ کھولے گئے تو ان مدارس کی جماعتوں میں ہندو طلبا کا وجود ایسے نام نظر آنے لگا وہ زبان جس پر سلطنت کے اہم امور کا دار و مدار ہے اس میں وہ جوش اور سرگرمی سے دلچسپی نہیں لیتے جیسا کہ ہیں ہونے اور یہ ذکر کیا لازم ہو گیا میں ہنود کی قلیل تعداد ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ دور عثمانی کی شاندار علمی یادگار جامعہ عثمانیہ کی طرف سے غفلت کی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور سحاب علم کی گوہر باری سے اپنے دامن مراد کو لبریز نہیں کرتے۔

جن ضلعوں میں ابھی اردو زبان کو دسترس حاصل نہیں ہوئی ہے وہاں ہنود کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے لیکن تجارت اور آبپاشی وغیرہ میں زیادہ آبادی کے لحاظ سے ہندوؤں کی کافی تعداد موجود ہے صنعت ہی کا ناکس استدلال اور عجیب و غریب وقیقہ سنجی ہندوؤں کی قابل استعداد ہی کو حضور پر نظام کا مصنب ناکرے ہی اور ایمان داری کا خاتمہ ہوتی ہے۔ حضرت کا فیاض دل کبھی اس بات کا روادار نہیں ہے کہ مسلمان تو علوم جدیدہ حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ عہدے پائیں اور ہندو آبادی کا بہت بڑا حصہ جہالت کی تیرہ و تاریک گھٹاؤں میں گھرا ہوا رہے ۱۹۲۱ء کے اعداد و شمار پر سرسری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں تعلیم گاہوں کی تعداد ۵۹۲۲ اور طلبا کی تعداد ۹۳۷۹۵۹ تھی لیکن دس سال کے عرصہ میں یعنی ۱۹۲۱ء میں اس تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ تعلیم گاہوں کی تعداد ۹۰۳۰۸ اور طلبا کی ۳۳۳۹۶۱ تک پہنچ گئی جس کو موجودہ تاجدار دکن کی علم نوازی اور علم دوستی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

سلطنت آصفیہ میں مسلمانوں کی حالت | ریاست حیدرآباد کے مسلمانوں کی موجودہ حالت دیگر صوبجات کے اہل اسلام سے بہت کچھ مشابہ ہے مگر وہ دور عثمانی کی

برکتوں میں اپنے خوشنما مستقبل کا جلوہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ انسانی
زندگی کے بعض لمحے برسوں سے زیادہ قیمت رکھتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا لمحہ ایسا ہوتا
ہے کہ اس میں زندگی کے نہایت اہم مقاصد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ حیدرآبادی مسلمان اُس
مبارک دن کے انتظار میں چشم براہ ہیں جس کی نورانی صبح اپنی زریں شعاعوں سے تیرہ
و تار اندھیرے کو دور کر دے گی۔ کوئی جماعت اس وقت تک اپنی خواہشوں کو
مکمل نہیں کر سکتی جب تک اُس کی مالی حالت درست نہ ہو جائے۔ صنعت و
حرفت۔ تجارت۔ زراعت نے اُن قوموں کو دولت مند اور مرفہ الحال بنا دیا ہے
جو گزشتہ صدی میں کوئی تاریخی درجہ نہ رکھتی تھیں۔ مسلمان نہ تجارت اور
صنعت و حرفت میں ہندوؤں کی برابر ہوئے ہیں اور نہ انھوں نے زراعتی شاخ
میں کوئی نمایاں ترقی کی ہے۔ دکنی زمینوں کی کاشت ۹۵ فی صد ہندوؤں کے
ہاتھ میں ہے۔ جاگیریں بلا تفریق مذہب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو دی جاتی
ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۱۹۶ ہے۔ گرسنت جی کے خیال میں جس طرح بڑے
جانور چھوٹے جانوروں کو نگل جاتے ہیں اسی طرح مسلمان ہندوؤں کو مرغی اور
مچھلی سمجھ کر ہضم کر رہے ہیں۔ دکن کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے فاتح ہونے
پر ہندوؤں کو ان کے گھر سے نہ ہٹایا اور وہ اسی طرح کاشت میں مشغول ہیں
جیسے مسلمانوں کی آمد سے پیشتر تھے۔ شاہانِ دکن میں علاء الدین حسن گنگوہی سے
جو خاندانِ بہمن کا پہلا بادشاہ گزرا ہے گنگو نامی برہمن سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ
برسرِ حکومت ہو جائے تو اپنے نام کے ساتھ گنگو کا لقب اختیار کرے گا۔ علاء الدین
نے حکمرانی کے وقت اسی وعدہ کو پورا کیا اور خاندانِ بہمنیہ کی حکومت کے وقت

سے اب تک اس ریاست میں برہمنوں کی قدر افزائی ہوتی رہتی ہے ملازمت کے صیغہ میں اب تک برہمنوں کا اثر موجود ہے۔ ہندو مسلم کی مالی حالت کا مقابلہ کیا جائے تو مرفہ الحالی اور تمول کا طرہ امتیاز ہندو کاشتکاروں اور مہاجنوں کے سر رہتا ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ متوسط الحال مسلمان ملازمت کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اور دیگر پیشے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے حیدر آباد کے زمانہ قیام میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دارالسلطنت میں ۹۰ فی صد تاجر ہندو ہیں گرد و پیش کے واقفات دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اضلاع میں تقریباً ۹۹ فی صد تاجر ہندو ہیں۔ مجھے اخبار نویس ہونے کی حیثیت سے ہر ایک طبقے سے ملنے جلنے اور ملاقات کرنے کا موقعہ ملا ہے میں نے وہاں کے ساہوکار ہنود کی حالت کو ان بڑے بڑے مسلمانوں سے بہتر پایا جو عہدہ دار ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ تمام ریاست میں ساہوکاروں کی تعداد ۶۱۷ کے قریب ہے جن میں سے ۵۹۶ ہندو ہیں اور صرف ۲۱ مسلمان ہیں جن مسلمانوں کے قبضہ میں زمینیں ہیں وہ زراعت کے اصول سے ناواقف ہیں اس لیئے بطور خود کام نہیں کرتے اور مالک آراضی کی حیثیت سے کاشتکاروں کو اصلی منافع ملنے کا موقع دیتے ہیں۔ پٹہ داری اور کاشتکاری پر ہندو قابض ہیں جس طرح مسلمان صنعت و حرفت میں کورے ہیں انہیں کاشتکاری سے بھی حس نہیں معلوم ہوتا۔ گو مسلمانوں کی جماعت میں موجودہ عہد کی برکتوں سے کسی قدر روشنی پھیل گئی ہے مگر ان میں ابھی ایسے اشخاص کی کمی نہیں ہے جو تجارت کو معیوب سمجھا اور کسی تجارتی کمپنی میں شریک ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے

ہوں۔ اعلیٰ حضرت کی دلی تمنا یہ ہو کہ مسلمان ہر شعبہ میں ترقی کریں لیکن ہندوستان
کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ابھی ان کی علمی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی
ہو۔ مسلمانوں کی تعلیم سے حضور نظام کی ہمدردی اور دلچسپی کے یہ معنی نہیں کہ دوسری
ہمسایہ قومیں علمی میدان کی چھوڑ دیں ان کی ہم قدم نہ بن سکیں بلکہ اس کی
بڑی وجہ یہ ہو کہ حضور کے نزدیک ایک ایسی قوم کو جو درماندہ ہو ابھارنا فرائض
حکمرانی میں داخل ہو۔ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں ہندو تعلیم یافتوں کی کثرت
اور مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو خراب دیکھ کر جناب لارڈ ہیسٹن صاحب بہادر
سابق لفٹنٹ گورنر نے مسلمانوں کے واسطے خاص مدارس و مکاتب کی اسکیم
جاری کی تھی۔ سیاسی نقطۂ خیال سے ایک یوروپین حکمران کی نگاہ میں ہندو اور
مسلمان دونوں مساوی تھے مگر جب اس نے ایک قوم کو تعلیمی حیثیت سے درماندہ
دیکھا اور اس کی مشکلات کا اندازہ کیا تو اس کو خاص امداد دینے کا انتظام کرنا
پڑا۔ اسی طرح حضور نظام کا مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ فرمانا تعصب کی دلیل
نہیں بلکہ یہ الطاف آئین ریاست کا جزو اعظم ہو۔ وہ زمانہ دور نہیں ہو کہ
جامع عثمانیہ اور دکن کی دیگر درسگاہوں سے ایسے طالب علم نکلیں جو اپنی دماغی تخیلات
کے ذریعہ تمام ہندوستان کو فائدہ پہونچا سکیں۔ موجودہ نظام کی فرماں روائی
تمام باشندگان دکن کے لئے (خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں، پارسی ہوں
عیسائی ہوں) ابر رحمت کے آگے بے شک ہو۔ مسلمانوں کی غفلت ہو کہ وہ
موجیں مارنے والے دریا میں اپنی مراد کا موتی نہ ڈھونڈیں اور اس قیمتی زمانہ
سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ ایک انگریز مصور جب شہر رفت کی تصویر بنانا

جو اس کے چہرہ کو اول سے دیکھتا ہوتا ہے اور اس کے پاؤں میں پڑا ہوا ہو۔ چہرہ پر بال لٹکے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت وہ گزرتا ہوا کسی کے سامنے آئے تو وہ اگلی زلف ہاتھ سے پکڑ لے جیسے ہی گزر جائیگا تو ہاتھ نہ آئے گا کیونکہ اس کے پیچھے پکڑنے کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ پاؤں میں پر لگنے کا باعث یہ ہے کہ وہ بہت جلد چلا جاتا ہے اور اس طرح جاتا ہے کہ پھر دوبارہ واپس نہیں آتا۔ مسلمانوں کو وقت موجودہ کو غنیمت سمجھ کر اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ سرورِ فنون کو بھی سیکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ صرف صیغہ ملازمت کو ذریعہ معاش بنانے سے وہ ترقی یافتہ اقوام کی طرح دنیا میں ناموری اور شہرت حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر مسلمانان دکن حصول ملازمت کا خیال چھوڑ کر علم کو علم سمجھ کر اس کے حصول کی جد و جہد کرینگے تو عجب نہیں کہ مسلمانوں کے علمی اقبال کا ستارہ پھر طلوع ہو کر حیدرآباد کی سرزمین پر جامع ازہر قرطبہ و غرناطہ جیسی درسگاہیں پیدا کر دے اور زمانہ تاریخ کے اوراق کو دوبارہ پلٹ کر ان کی سوئی ہوئی روح کو جگا دے۔ نہ صرف قدیم علوم کا مرکز ہو بلکہ جدید علوم کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن حیدرآباد کو آکسفورڈ اور کیمبرج کا ہمسر بنا دے۔ اور ہندوستان کے لنگوا فرنکا یعنی زبان اردو کو یورپ کی دوسری مہذب زبانوں کی طرح دنیا میں علوم و فنون کا سرچشمہ ثابت کر دے اور میر عثمان علی خاں بہادر کا نام نامی علمی دنیا میں ہارون الرشید اور مامون الرشید کے ناموں کے ساتھ لیا جائے۔

موجودہ فرماں روائے دکن کا نظام حکومت رعایا پروری وعدل گستری کے زریں کارنامے

موجودہ فرماں روائے دکن مغربی ومشرقی پالیٹکس سے باخبر

اور زمانہ کی رفتار سے بخوبی واقف ہیں۔ ریاست حیدرآباد کے دور حاضرہ نے شاہان مغلیہ کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ اس وقت دولت آصفیہ میں تعلیم تجارت صنعت و حرفت کے متعلق جو کارنمایاں کیے جا رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں اور اُس کی شہرت ہندوستان سے لیکر ولایت تک پہونچ گئی ہے سنہ ۱۹۲۱ء میں لندن کے مشہور اخبار پال مال گزٹ نے لکھا تھا کہ حضور نظام دکن کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ جب مسلمانوں کی نگاہیں ہندوستان سے نکل کر ادھر اُدھر دوڑ رہی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان کی سلطنت کے اندر کوئی ایسا مرکز نہ بنا دیا جائے جہاں وہ ٹھہر سکیں۔ امیر افغانستان کو ہز مجسٹی کا خطاب دیے جانے سے ان کا جو کچھ اعزاز ہوا اُس سے برطانیہ کے دشمنوں نے فائدہ اُٹھایا اور مسلمانوں کو افغانستان کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دلی خواہش یہ ہے کہ ان کی قوم میں سے کسی کو بادشاہ بنایا جائے ہندوستان میں کسی مسلمان حکمراں کے زیر تخت اتنی بڑی آبادی نہیں جس قدر حضور نظام کے ماتحت ہے۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ہی سے آپ برطانیہ کے یار وفادار کہلاتے ہیں اور یورپ کی جنگ میں آپ نے اعلی خدمات انجام دیے ہیں"۔ اسی زمانہ میں پال مال گزٹ کے اس مضمون کی تائید میں ہندوستان کے انگریزی اور اردو اخبارات نے آواز اُٹھائی تھی۔ اور

عرصہ دراز تک اس مسئلے پر خامہ فرسائیاں کی گئی تھیں۔ دولت آصفیہ کی موجودہ وسعت دنیا کی اکثر سلطنتوں کے رقبہ سے زیادہ ہے اور اس کی سطح سمندر کی سطح سے بارہ سو فٹ سے ڈھائی ہزار فٹ تک بلند ہے۔ ایک سیاح جب اس کے شمالی اور مغربی حصوں کی شادابی کو دیکھتا ہے تو اعلیٰ حضرت کی رعایا نوازی کا اعتراف کرتے ہوئے موجودہ دور کو زمانہ ماضی پر ترجیح دینی پڑتی ہے۔ پرانے زمانے میں دکن کے اندر ہیرے کی کانیں اپنے آغوش میں قیمتی جواہرات رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاجدار دکن نے حیدرآباد کی پتھریلی زمین پر علم و عمل کے گوہر افشانیاں کی ہیں وہ ان معدنیات سے کہیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔ اس ملک میں قدیم زمانہ سے روئے زمین کی تمام قومیں آباد ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی دلی خواہش ہے کہ گونڈ بھیل وغیرہ جیسی وحشی اقوام کو شائستہ اور مہذب بنایا جائے اور اسی کام کے واسطے معقول رقم خرچ کی جاتی ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان خلد اللہ ملکہ اگست ۱۹۱۱ء میں تخت نشین ہوئے ہیں اور آپ کے زمانہ حکومت پر دکن کی رعایا عام طور سے طمانیت کا اظہار کرتی ہے گزشتہ بارہ سال میں اعلیٰ حضرت نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ رعایا کی آسودگی انصاف اور رواداری کے اوصاف تاج شاہی کی رونق کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ حضور کی رواداری کی تازہ مثال اعلیٰ حضرت کا وہ فرمان ہے جو عید اضحی کے موقعہ پر قربانی گاؤ کی ممانعت کے بارہ میں صادر ہوا ہے کیا کوئی ہندو ریاست مسلمان رعایا کے ساتھ اس قسم کی رواداری کی مثال پیش کر سکتی ہے؟

حضور نظام کی علمی فیاضی

ہنوز صوبہ برار کی واپسی کا مسئلہ معرض التوا میں ہے مگر اعلیٰ حضرت علم دوست ہونے کی حیثیت سے وہاں کے باشندوں کے آج بھی مددگار ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں بندگان عالی کی بارگاہ سے یہ حکم صادر ہوا تھا کہ طلبائے برار کو سرکاری خرچ پر ولایت بھیجنے کے لیے حیدرآبادی طلبا کی برابر سمجھا جائے اور ایشیائی اور یورپی اسکالرشپ کے متعلق وہی حق دیا جائے جو حیدرآباد کے طالب علموں کو حاصل ہے۔ کیا یہ علمی فیاضی سنت نہال سنگھ کے اس اعتراض کی تردید نہیں کرتی جس میں ہندو طلبا کو وظائف نہ دیے جانے کا رونا رویا گیا ہے؟

سوشل اصلاحیں

یوں تو دورِ عثمانیہ میں آئے دن سوشل اصلاحیں ہوتی رہتی ہیں اور اخلاقی امور کی بابت طرح طرح کے فرامین صادر ہوتے رہتے ہیں جن کو جمع کیے جانے سے ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے مگر شراب نوشی کے انسداد میں جو تدابیر عمل میں لائی گئی ہیں انھوں نے اس منحوس اور خراب رسم کو مٹا کر بے شمار دولت کا تحفظ کر دیا ہے۔ اسی اخبار ہند و نے جو آج کل دولت آصفیہ کے خلاف مضامین شائع کر رہا ہے ۱۹۲۲ء میں یہ جھوٹی خبر شائع کی تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے حضور نظام کو کامل امتناع شراب نوشی کی پالیسی پر عمل کرنے سے باز رکھا۔ مدراس گورنمنٹ کو اس کی تردید کرنی پڑی اور اس موقع پر نظام گورنمنٹ کی جانب سے ۴ ارمئی ۱۹۲۲ء کو ایک فرمان شائع ہوا جس کا مضمون حسب ذیل ہے:

"ریاست حیدرآباد کی پالیسی متعلق آبکاری کا منشا یہ ہے کہ ریاست کی طرف سے سخت نگرانی اور واحد اجارہ منشی عرقیات کی کشید گی اور نقل و حرکت پر قائم رہے۔ اور اتنا زیادہ محصول آبکاری لگایا جائے جو

نہ صرف الکحل کا استعمال پھیلنے کو روکے بلکہ شراب کے استعمال کو بھی گھٹائے اور اس طرح یہ اطمینان حاصل ہو کہ گورنمنٹ کی آمدنی لوگوں کے اخلاقی خرچ پر حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بیان کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ اس پالیسی کے نتیجہ کے طور پر الکحل کے استعمال میں ۵۰ فیصدی کی تخفیف ہو چکی ہے"

"تیاری و فروخت شراب کی کامل ممانعت ممکن نہیں کیونکہ اس سے صرف بڑے پیمانہ پر ناجائز کشید گی کثرت کے ساتھ خانگی بھٹیاں قائم ہونے تک نوبت پہنچیگی جن کا پتہ لگانا اور مسدود کرنا مشکل ہوگا اس طرح کامل امتناع کا شراب خواری کی عادت کو بڑھانے کا اُلٹا اثر پڑیگا۔ کیونکہ تیاری شراب کو قابو میں رکھنا اور اُس کے استعمال کو روکنا سراسر ناممکن ہے۔ اور عرقیات کی تیاری اور تقسیم کو روشن خیالی کے ساتھ قابو میں رکھنے کی جس پالیسی کا حوالہ دیا گیا ہے اُس میں ریاست حیدرآباد کو گورنمنٹ ہند اور مقامی نظامت کی پوری واقفیت و تائید حاصل رہی ہے اور مذکورۂ صدر مضمون کے اندر جو گمراہ کن بیانات کیے گئے ہیں ان کی میں قطعی طور پر تردید کرتا ہوں کہ حکومت انگریزی سے ریاست حیدرآباد کی آبکاری کی پالیسی کو ضعیف کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی ہے۔ یہ بیان کہ معاملے نے یہاں تک طول کھینچا ہے کہ انگریزی حکام نے حضور نظام سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے حامی امتناع وزیر اعظم سر علی امام کو موقوف کردیں اور ایک اور شخص کو ان کے بجائے منتخب کریں جو انگریزی خواہشوں کا زیادہ خیال کرے گا باقی ماندہ پیراگراف بھی ایسا ہی ہے جس میں وہ گمراہ کن بیان درج ہے۔ اخبار ہند کے ایڈیٹوریل کالموں میں مسٹر جانسٹن کے اُن نہایت حیرت انگیز انکشافات کی نسبت جو بیان کیے گئے ہیں اُن پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ غلط صغری و

وکری پر مبنی ہیں۔"

عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علیحدگی

برٹش انڈیا میں جس اصلاح کی ضرورت تقریباً پون صدی سے محسوس کی جا رہی ہی۔ ہز ایگزالٹیڈ ہائی نس نے اس اسکیم کو عملی صورت دینے میں پیش قدمی فرمائی اور ۱۹۲۲ء میں اس مضمون کا فرمان صادر فرمایا کہ عدالتی اور انتظامی اختیارات فوراً علحدہ کر دیئے جائیں۔ اس فرمان مبارک میں یہ ظاہر کیا گیا ہی کہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے یہ اصلاح اس یقین پر کی ہی کہ یہ تبدیلی ضرورت ملک کے انتظام میں بہتری کا سبب ہی نہ ہوگی بلکہ رعایائے دکن کی فلاح و بہبودی اس سے وابستہ ہی۔

صنعت و حرفت کی ترقی

یوں تو ریاست میں ایک مستقل محکمہ صنعت و حرفت کا قائم ہی اور چھوٹی چھوٹی ملکی صنعتوں کو رواج اور ترقی دینے کے لیے کاریگروں کی مختلف طریقے سے مدد کی جاتی ہی۔ لیکن سالانہ نمائش کا انعقاد جو ہر سال سالگرہ مبارک کے موقعہ پر ہوتا ہی خاص طور پر قابل ذکر ہی۔ مشرقی بادشاہوں راجوں نوابوں کی سالگرہ کے جشن کی تکمیل رقص و سرود اور اسی قسم کے دیگر کھیل تماشوں کے بغیر نہیں ہوا کرتی لیکن حضور شہریار دکن نے اس رسم کو توڑ دیا ہی اعلیٰ حضرت کی سالگرہ کے موقع پر ناچ رنگ اور دوسرے خلاف تہذیب امور کی ممانعت ہی۔ اور اس موقع پر صنعت و حرفت کی ترقی کو مدنظر رکھ کر ملکی مصنوعات کی نمائش نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب دی جاتی ہی۔ مارچ گذشتہ میں اڑتیسویں سالگرہ کی تقریب میں یہ

نمائش پورے ایک ماہ تک قائم رہی تھی اور اسی زمانہ میں یہ فرمان مبارک جاری ہوا تھا کہ نمائش کے لیے ایک مستقل عمارت تیار کی جائے جس کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی منظوری دی گئی تھی

ترقیات عامہ کی اسکیم یہ اسکیم سابق صدر اعظم نے پیش کی تھی جن کی رو سے اراضیات لاؤنی پر اُٹھائی جانے والی تھیں لیکن ابھی تک کوئی عملی کارروائی نہیں ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جن شرائط پر زمینوں کا اُٹھانا قرار دیا گیا ہے وہ قابل عمل نہیں۔

بندگان عالی متعالی کی نظر دوربین نے فوراً اس کے نقائص کو تاڑ لیا اور یہ اسکیم معرض التوا میں پڑ گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکومت کو کروروں روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ اور اہل ملک کو بھی طرح طرح کی دقتوں کا سامنا ہوتا۔

سنت جی نے بھی اس اسکیم کا ذکر کیا ہے مگر اس کے نقائص دکھانے سے پہلو تہی کی ہے جس سے اُن کی جنبہ داری کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے واقعات نگاری کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ذاتی حالت کو جب تک عارضی حالت سے جدا نہ کیا جائے واقعیت ظاہر نہیں ہو سکتی کیونکہ عوارض پر حکم لگانا ٹھیک نہیں ہے۔"

اسی طرح عدالتی اور انتظامی اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے سنت جی نے اس کا مفید اور بانتیجہ ہونا ثابت کیا ہے اور اس اسکیم کا مصنف بھی سابق صدر اعظم صاحب کو بتایا ہے لیکن یہاں پر بھی ان کی تنگدلی اور تعصب نے اعلیٰ حضرت کی بیدار مغزی کی جنھوں نے بلا لحاظ قوم وملت عام رعایا کی بہبودی کو مد نظر رکھ کر اس کی منظوری

کا فرمان صادر فرمایا تعریف کرنے سے احتراز کیا۔ فارسی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبے است

سنت جی کے مضامین کا اثر دوسرے ہندو اخبارات پر

آخر میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سنت نہال سنگھ نے اخبار ہندو مدراس میں جو مضامین اس ریاست کے خلاف چھپوائے اور اس میں فرمان روائے دکن کے خلاف جو زہر اُگلا اُس کی ایک وجہ موجود تھی کہ اُن کو منہ مانگے ٹکے نہ ملے اور وہ خفا ہوگئے۔ لیکن بعض دوسرے آریہ اور ہندو اخبارات نے آنکھوں پر کیوں ٹھیکری رکھ لی ہے۔ اِدھر اخبار ہندو میں سنت جی کے مضامین کا نکلنا تھا کہ اخبار ملاپ۔ نیشن۔ سدھارک وغیرہ نے سلطنت آصفیہ اور اُس کے فرماں روا پر زہر اُگلنا شروع کردیا اور بالخصوص اخبار ہندو کے داخلہ ممالک محروسہ کی ممانعت کا فرمان دیکھ کر یہ متعصب اخبار تو بھی چراغ پا ہوگئے۔ آگرہ کا ایک ہندو اخبار "سدھارک" اس قدر از خود رفتہ ہوا کہ اُس نے اپنی یکم اکتوبر کے الیشو میں اس خبر کا عنوان "نظام کی بد۔۔۔۔" قائم کیا۔ حضور نظام کے نام کے ساتھ ایک ایسے مکروہ لفظ کا لکھنا اسی اخبار کا کام ہوسکتا ہے۔

تہذیب معاشی کے برعکس اظہار خیال کے لیے وہ لفظ جس کو سدھارک نے حضور نظام کے ساتھ منسوب کرکے اپنے کمینہ جذبات کو پورا کیا ہے۔ شرفا کے طبقہ میں معمولی اشخاص کو خطاب کرتے وقت بھی نہیں بولا جانا چاہئے کہ ایک مقتدر والی ملک کی شان میں ایسی گستاخی نہ معلوم گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے

اراکین نے اخبار سدھارک آگرہ کے اس طرزِ عمل کو کس نظر سے دیکھا
اس قسم کی اخلاق سے گری ہوئی حرکات سے ظاہر ہوتا ہی کہ جب دلوں میں
کدورت ہوتی ہی اور غصہ ہوتا ہی تو انسان کی عقل صحیح نہیں رہتی شمالی ہند
میں سنگٹھن اور شدھی کی جو تحریک ہندؤں میں پھیل رہی ہو اور جس نے تمام ملک میں
شورش پھیلا دی ہی اُس نے ہندو پریس کو برافروختہ کر دیا ہو اسی لیے انھیں اسلامی مالک
کو جو لاکھوں ہندوؤں کا آقا اور ولی نعمت ہو برا کہنے میں پس و پیش نہیں ہوتا
لیکن اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ چاند پر خاک ڈالنے سے چاند نہیں چھپ سکتا اور
سلطنت آصفیہ کی ضرب المثل رواداری معدلت گستری اور رعایا
پروری کو رعایائے دکن خوب سمجھتی ہو وہ اپنے نادان دوستوں کے
اُن خدمات کی جو ریاست حیدر آباد پر ناواجب نکتہ چینی کی صورت میں یہ
لوگ انجام دے رہے ہیں داد نہیں دے سکتی اور اُن کو بے ساختہ کہنا پڑتا ہی
کہ خدا ہم کو ہمارے نادان دوستوں سے بچائے۔

خاکسار
نظامی - بدایونی

بدایوں ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء

تمام شد

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
یو۔ پی

۹۵۴۳۸

Due Date